⊙ سلیم تقی شاہ
پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
⊙⊙ ڈاکٹر محمد آصف اعوان
صدر شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

جعفر طاہر کی نظم گوئی

Abstract:

In the beginning Urdu poem was only limited to the description of nature. It took a long way of three centuries to address contemporary challenges. Jafar tahir made new attempts in traditional pattern of poem not depending on the new forms followed by modern poem writers. He focused on religion and concrete happenings on the earth around him. This article covers all aspects mentioned above.

Keywords:

Jafar Tahr Poetry Poem Religion

'نظم' کا لفظ شاعری میں ایک خاص صنف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ 'نظم' کے عام مفہوم کے مطابق ہر کلامِ منظوم نظم ہے۔ اگر اس لفظ کے اصطلاحی معنوں کا جائزہ لیا جائے تو 'نظم' اشعار کے ایسے مجموعے کا نام ہے جس میں کسی موضوع پر تسلسل کے ساتھ اظہارِ خیال ملتا ہو۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ نظم میں شاعر کسی موضوع پر فلسفیانہ یا بیانیہ انداز میں اپنے خارجی و داخلی تاثرات کو بیان کرتا ہے۔ وسیع تر مفہوم میں اردو نظم کا اولین نمونہ دکن میں قائم بہمنی سلطنت کے دورِ آخر میں 'کدم راؤ پدم راؤ' کی صورت میں ملتا ہے۔

نظم بہ طور صنف کے اولین نقوش بھی سرزمینِ دکن پر ہی صوفیانہ اور مذہبی کلام کی صورت میں دستیاب ہیں۔ نظم نگاری کے اس ابتدائی دور میں نظموں کے موضوعات میں بڑا تنوع نظر آتا ہے۔ دکنی شعرا نے مذہب، اخلاقیات، تصوف، حسن و عشق، تہذیب و معاشرت جیسے موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ دکنی شعرا کا خاص میلان واقعہ نگاری بالخصوص جنگ ناموں یا رزم ناموں کی طرف بھی مائل دکھائی دیتا ہے۔ ان رزم ناموں میں وطنی عصبیت اس امر کی غماز ہے کہ شعرا کو ارضِ وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ حب الوطنی کا یہ بیان درحقیقت اس دکنی تشخص کی دین ہے جو شمال سے

الگ ہونے کے بعد ردِعمل اور سیاسی ضرورت کے طور پر اہلِ دکن میں پروان چڑھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دکنی شعرا نے جنگ ناموں میں جہاں جنگ و پیکار کے مناظر دکھائے ہیں وہاں اپنے دور کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کو بھی کمال فنکاری سے پیش کیا ہے۔ سرزمینِ دکن کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پہلا صاحبِ دیوان شاعر، سلطان محمد قلی قطب شاہ کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ ان کے کلام کے غالب موضوعات خالص مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی تہواروں اور موسموں پر بھی مشتمل ہیں۔

شمالی ہندوستان میں اردو نظم کے ابتدائی نمونے جعفر زٹلی کے یہاں ملتے ہیں۔ جعفر زٹلی اپنے پھکڑ پن اور فحش گوئی کی بدولت مشہور ہیں لیکن انھوں نے اپنے عہد کی معاشی، حکومتی اور معاشرتی زبوں حالی کو اپنے مخصوص ہجو یہ انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ اس عہد کے زوال اور انحطاط کی پوری تصویر واضح ہو جاتی ہے۔ ایہام گو شعرا کے یہاں بھی نظموں کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں جن میں بالخصوص نواب صدرالدین محمد خاں فائزؔ اور شاہ ظہورالدین حاتمؔ کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔ 'دیوان زادہ' میں متعدد موضوعات پر نظمیں شاہ حاتمؔ کے عصری مسائل اور خارجی مسائل کی ترجمان ہیں۔

عہدِ زریں میں میرؔ و سوداؔ کے یہاں اگرچہ متقدمین کی طرز پر موضوعاتی نظمیں تو نہیں ملتی تاہم سوداؔ نے اپنے شہر آشوب، ہجویات وغیرہ میں سیاسی و سماجی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر کشی کی ہے۔ اسی طرح میرؔ کے یہاں شکار ناموں اور مختصر مثنویوں میں بھی اس عہد کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی انحطاط کی تصویر نمایاں ہے۔ ہر چند دونوں شعرا کی حیثیت نظم نگار کی تو نہیں ہے تاہم ان کی تخلیقات میں موضوعاتی نظم کی صفات ضرور موجود ہیں۔ اس عہد کے مجموعی مزاج سے ہٹ کر نظیرؔ اکبر آبادی نے نظم کی روایت کو استحکام آشنا کیا۔ سماجی زندگی کے متعدد پہلوؤں کو عوامی زبان میں نہایت خوب صورتی سے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ موضوعات کا یہ تنوع نہ ہی ان کے متقدمین اور نہ ہی ان کے معاصرین کے یہاں ملتا ہے۔

نظیرؔ اکبر آبادی نے جہاں موضوعاتی نظموں کو وسعت عطا کی وہیں انجمن پنجاب نے اس سلسلے کو مزید جاندار انداز میں مروج کیا۔ موضوعاتی نظموں کے حوالے سے محمد حسین آزادؔ اور الطاف حسین حالیؔ کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے فطرت نگاری، حقیقت نگاری اور منظر نگاری پر خاص توجہ دی اور بعض قابلِ ذکر نظمیں بھی تخلیق کیں۔ اس طرزِ نظم نگاری کو مروج کرنے والوں میں اکبرؔ الہ آبادی، شبلیؔ نعمانی، چکبستؔ، سرورؔ جہاں آبادی، تلوک چند محرومؔ، خوشی محمد ناظرؔ، شوقؔ قدوائی، علامہ محمد اقبالؔ، سیمابؔ اکبر آبادی، حفیظؔ جالندھری، ساغرؔ نظامی، جمیلؔ مظہری، احسان دانشؔ، جوشؔ ملیح آبادی اور روشنؔ صدیقی کے نام شامل ہیں۔ بعد ازاں ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے پلیٹ فارم سے جو موضوعاتی نظمیں سامنے آئیں ان میں سے بیش تر کا موضوع اجتماعیت، استحصال، تحریکِ آزادی اور انقلاب وغیرہ تھا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے عرصے میں نظم کا عمومی مزاج ایک جیسا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد موضوع، ڈکشن، ہیئت میں واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن تہذیب و ثقافت و تمدن کے ساتھ داخلی اقدار اور مذہبی امورِ ہجرت، قومی و ملی جیسے موضوعات برابر برتے جاتے رہے۔ اردو شعرا کی ایک پوری کھیپ تھی جو عرصے تک ان موضوعات کو اپنی شعری فتوحات کا حصہ بناتی رہی۔ قومی و ملی شاعری کے واضح اور مضبوط آثار علامہ اقبال کے یہاں کھل کر سامنے آئے۔ بعد ازاں جعفرؔ طاہر نے ان

موضوعات میں رنگا رنگ اضافے کیے۔جعفر طاہر نے پاکستانی سماج اور تہذیب کو قلم کے ذریعے نئی زندگی دی۔وطن پرستی،قومی یک جہتی اور تہذیبی عظمت وجلالت جیسے موضوعات پر پُر جوش انداز میں نظمیں تخلیق کیں۔

حقیقت پسندوں کے نزدیک ادب کی کوئی بھی صنف سماج سے الگ رہ کر تخلیق نہیں کی جا سکتی بلکہ ہر صنفِ ادب کا منبع اوّل وآخر سماج یا تہذیب وثقافت کو گردانتے ہیں۔ان کے نزدیک ادب اور سماج میں اٹل اور ان مٹ رشتے قائم ہوتے ہیں۔ادیب جو کہ کسی سماج کا حصہ ہوتے ہیں وہ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں،حادثات،انقلابات،ایجادات،رسم ورواج سے بہر حال متاثر ہوتے ہیں۔ تہذیب وثقافت ادب کو کئی پہلوؤں سے متاثر کرتے ہیں جن کی وجہ سے ادب تخلیق کیا جاتا ہے۔ De Bonald نے اٹھارویں صدی میں ادب اور معاشرہ کے رشتہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"Literature is the expression of society"

یعنی: ''ادب معاشرے کا وسیلۂ اظہار ہے''۔(۱)

شیلے کا نقطۂ نظر بھی اس اقتباس سے قدرے مماثل ہے۔اس نے بھی سماج کو شاعری کا جزوِ لازم قرار دیا ہے۔اس کے مطابق شاعری سماج کی ازلی صداقتوں اور زندگی کی حقیقی اور تخیلی عکس ریزی کا نام ہے۔زندگی اور شاعری کو اس نے ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم قرار دیا۔اس کے مطابق:

☆ شاعری انسانی صداقت کا سب سے نفیس اظہار ہے۔

☆ شاعری بہترین ذہنوں کے خوش گوار اور بہترین لمحوں کا ریکارڈ ہے جو انسانیت کی آخری پناہ گاہ ہے۔

☆ شعرا انقلابی خیالات کی تشہیر کر کے ہمارے وجود میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔

☆ بڑے شعرا ہمیشہ بڑے جنگجو رہے ہیں جنہوں نے ہمیشہ عوام کے حق میں شاعری کو اپنا آلۂ کار بنایا ہے۔

☆ شعرا پیغمبر کا درجہ رکھتے ہیں جنہیں مستقبل کا علم ہوتا ہے جس کی طرف وہ اشارے کرتے ہیں کیوں کہ ان پر فیضِ ربانی کا سایہ ہوتا ہے۔اسی لیے وہ اکثر یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں،گویا اپنا کہا ہوا خود وہ نہیں سمجھتے اور نہ یہ سمجھتے ہیں کہ کون سی طاقت ان سے کہلوا رہی ہے۔اس کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ:

"Poets are the unacknowledged legislators of the world"

''شعرا دنیا کے غیر تسلیم شدہ قانون ساز ہوتے ہیں۔''(۲)

حقیقت یہ ہے کہ ادیب کبھی براہِ راست طریقِ اظہار اختیار نہیں کرتا بلکہ فنکارانہ وسائل کے ذریعے فن پارے کو بالواسطہ طرزِ اظہار عطا کرتا ہے۔براہِ راست طرزِ اظہار کے تخلیق کار کسی منشور کے ساتھ خطیبانہ لہجہ اختیار کرتے ہیں جب کہ بالواسطہ طرزِ اظہار میں تخلیقی آزادی کو فوقیت دی جاتی ہے۔اردو نظموں کے ترقی پسند تناظر پہ نظر کریں تو متعین موضوعات اور دیے گئے اصولوں کے مطابق براہِ راست اظہار کو اہمیت دی گئی ہے۔زندگی کا انفرادی یا اجتماعی پہلو ہمیشہ ان کے مدِّنظر رہا،بالخصوص معاشی جدلیات کو مطمحِ نظر بنایا۔ان کے موضوعات اور طرزِ اظہار بہ طورِ خاص جماعتی اور گروہی منشور کا حاصل جمع تھے۔عقیل احمد صدیقی نے حقیقت نگاری کے اسی پہلو پر اس طرح سے روشنی ڈالی ہے:

''موضوعات متعین ہیں اور طرزِ اظہار میں یہ بات مستحسن ہے کہ رائج فارم میں اپنی بات پیش کی

جائے۔ پھر موضوعات کے بارے میں ترقی پسند رویہ رہا ہے کہ فنکار کو عوامی احساسات کا ترجمان ہونا چاہیے۔۔۔ترقی پسند نظموں میں رائج موضوعات وہ ہیں جن کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ مثلاً آزادی، انقلاب، انسان دوستی، امن، جمہوریت وغیرہ۔ ترقی پسند شاعروں نے ان مجرد تصورات کی توضیح و تعبیر اور اس کی سماجی افادیت کو شاعری کا موضوع قرار دیا ہے اور طرزِ اظہار میں وضاحت و صراحت اور براہِ راست طرزِ اظہار اختیار کیا ہے۔"(۳)

جس عہد میں جعفر طاہر نے آنکھ کھولی وہ عہد موضوعاتی اور براہِ راست سلیقۂ اظہار کا عہد تھا۔ فنکار جس قدر بھی ماحول سے بے زار اور بے نیاز ہو پھر بھی اس کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔ جعفر طاہر ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا انہوں نے براہِ راست طرزِ اظہار کو اپنایا اور اس نے بعض با کمال نظمیں پیش کیں۔ ہر شعر عنوانات کی سمتوں کی طرف رہنمائی کرتا نظر آتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ جو خواب وابستہ تھے ان کی تعبیر کو مثبت انداز نصیب نہ ہوا۔ جس تہذیت کو لوگوں کے ماڈل کے طور ہر اپنے اذہان میں جگہ دی تھی وہ آلودہ ہو چکی تھی۔ انسانیت کے التزامات اور اقدارِ حیات کو پامال کیا جا رہا تھا۔ معاشرے کی تہذیب کیا ماند پڑی کہ جبر و استحصال بنیاد بن کرا بھر رہے تھے۔ جعفر طاہر کی شاعری محض تفننِ طبع کا حاصل نہیں ہے بلکہ با قاعدہ ایک مقصد و منشور کی حامل ہے جس میں تہذیب و ثقافت کی روح سانس لیتی نظر آتی ہے۔ قومی و ملی ذمہ داریوں کا احساس دلاتی ہے۔ زیرِ فلاکت اور متوسط طبقہ کو تحریک دینے والی شاعری ہے۔ تہذیب و ثقافت پر پڑی دبیز تہوں کو ادھیڑتی اور شفاف کرتی ہے۔ اپنے دیس کی موانست و محبت کا اعلامیہ ہے۔ جعفر طاہر محض شعلہ نوائی یا نغمہ سرائی نہیں کرتے بلکہ با قاعدہ ایک انقلابی لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ ان حساس دل لمحہ بہ لمحہ ایک کرب و اذیت سے دو چار ہوتا ہے مگر وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کی شعری بصیرت کا دائرہ بہت وسیع ہے جو عام سے لے کر خاص تک کو موضوع بناتا ہے، مسائل کی طرف اشارے کرتا ہے، ان کے حل کے لیے تدبیر کرتا ہے۔ جمہوری نظام اور قومی یک جہتی کو معیارِ انسانیت قرار دیتا ہے۔ تہذیبِ انسانی کے بنیادی و اثاثی پہلوؤں کو روشن کرتا ہے۔ جعفر طاہر اپنے موضوعات کے شارح اور داعی ہی نہیں بلکہ وہ پوری دیانت داری سے ان کے پاسدار بھی ہیں۔ شاعر تو وہ تھے ہی اس سے افواجِ پاکستان میں ملازمت نے ان کے شعری کینوس کو اور زیادہ وسیع کیا، اسی لیے ان کی نظموں میں قومی و ملی تڑپ زیادہ نظر پڑتی ہے۔

جعفر طاہر کے یہاں نظم کی ہیئت کبھی مسئلہ بن کر نہیں ابھری، انہوں نے مروجہ پابند ہیئت کو ہی اختیار کیا۔ فنی اعتبار سے وہ نظم کے ضمن میں وحدت و کلیت کے دعوے دار شاعر ہیں۔ وہ تجربے اور مشاہدے کے بطن سے اٹھنے والی لہر کو راہ دیتے ہیں نہ کہ شعوری طور پر اس کی کرافٹ میں ردوبدل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ:

"نظم کے نئے تقاضے کیا ہیں۔ فنی تقاضوں میں وہ تمام شعری مطالبات شامل ہیں جو کسی خیال یا تجرید کو منزلۂ شاعری پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ ان میں بنیادی شے خیال یا تجربے کی وحدت و کلیت ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ فن کار ہیئت کو نامیاتی سمجھے جو دراصل خیال یا جذبہ کا نمو ہے، جو تجربے کے بطن سے پھوٹتا ہے اور بہ قول کولرج آگے کی طرف بڑھتا ہوا عضویاتی کل میں بدل جاتا ہے۔ یہ ارتقا یوں تجربے کے بطن سے پیدا ہوتا ہے لیکن اس کی ظاہری شکل بھی مکمل طور پر

جلوہ گر ہوتی ہے۔'' (۴)

مذکورہ اقتباس کے مصداق جعفر طاہر کی شاعری میں انتشار کی صورت نہ ہونے کے برابر ہے۔انہوں نے ہمیشہ جذبہ واحساس کے آہنگ کو نظم کی وحدت اور کلیت میں پرو دیا۔ان کے یہاں خارجی شواہد یا ذاتی میلانات/ ردِعمل نظم کی ہیئت کو متاثر نہیں کرتا بلکہ ان کے ادغام اور انضمام سے نظم وجود پاتی ہے جس سے نظم کی سالمیت متاثر نہیں ہوتی۔جعفر طاہر اسی کی بدولت نظم کی جمالیاتی تنظیم وتشکیل اور ترتیب کرتے ہیں۔موضوعاتی اور سچے شعری اظہار کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

جمہوریہ بنا تھا مرا ملکِ پاک آج
یہ میرا ملک، نور کی کشور کہیں جسے
دستورِ سرزمینِ وطن بھی بنا تھا آج
دستور وہ کہ عدل کا دفتر کہیں جسے (۵)

مذکورہ بالا اشعار جعفر طاہر کی نظم 'حسنِ امروز' سے لیے گئے ہیں جو ماہِ نو کراچی، جمہوریت نمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔یہ نظم ۲۳ ؍مارچ ۱۹۵۶ء جب مملکتِ خداداد پاکستان،اسلامی جمہوریہ پاکستان بنا اس تناظر میں لکھی گئی۔اپنی ریاست کی تعریف میں شاعر نے اپنے تخیل سے اسے عطائے خداوندِ ذوالجلال قرار دیا ہے۔اس دن کو انہوں نے 'رحمتِ داور' اور 'لطفِ پیمبر' قرار دیا ہے۔وطن پرستی کے حوالے سے اس نظم کو جعفر طاہر کی اہم نظم گردانا جاسکتا ہے۔

'قومی ترانہ' کے عنوان سے انہوں نے ایک اور نظم تخلیق کی۔اس نظم کا فکری برتاؤ نئی نسل کو یہ باور کراتا ہے کہ سماج اب مکمل طور پر بدل چکا ہے اس لیے نئے عزم کے ساتھ پوری قوت، جوش وجذبہ سے اٹھے اور ریاست کی فلاح کے لیے کام کرے۔تہذیبِ اسلامی کے احیا کے دن ہیں اس لیے ہر فرد شیر، دلیر، مجاہد اور گبھرو بن کے اٹھے اور نئے دور کا آغاز کرے۔وہ دور جس پہ ان کا اپنا راج ہو۔ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

ایک نرالا سورج چمکا پھیلا نیلا سویرا
اُونچا سبز پھریرا
آج عوامی دور ہے بھائی راج ہے تیرا میرا
سب کا ہاتھ بٹانا
آگے قدم بڑھانا
آیا نیا زمانہ
گائیں نیا ترانہ (۶)

۱۹۶۵ء کی جنگ کے تناظر میں جعفر طاہر نے 'گمنام سپاہی' کے نام سے ایک نظم تخلیق کی۔ہر چند عنوان کسی ایک سپاہی کی داستان معلوم ہوتا ہے۔نظم کے جملہ مصرعوں میں جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے پوری پاک فوج کے جوانوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے اور بالخصوص ان جوانوں کو، جو حالتِ گمنامی میں ہیں، جن کی قبر کا نشان تک نہ بن سکا۔ہر

مصرع میں جو سوزِ جذبہ اور درد جوش پوری قوت سے عیاں ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:

خاک میں کیا صورتیں رہ رہ کے پنہاں ہو گئیں
مٹ کے بھی تو لالہ گل میں نمایا ں ہو گئیں
بن گئیں رنگ شفق حسن گلستاں ہو گئیں
کھیتیاں شاداب شاخیں گل بداماں ہو گئیں
سرخ پھولوں کی ہنسی یہ سایہ اشجار میں
غم نہیں یہ شیر دل ہیں آج بے نام و نشاں
کیا ہوا قبریں نہیں سر پر نہیں ہے سائباں
امتحاں لیتا ہے یوں بھی اہلِ دیں کا آسماں
یہ ہمارے تھے رہیں گے یہ ہمارے درمیاں
ایک گھر والے ہوں جیسے سایہ دیوار میں (۷)

قومی نظموں میں ایک نظم 'نشاطِ رواں' کے نام سے 'ماہِ نو' جمہوریت نمبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی جس کا موضوع قومی دن کے حوالے سے ہے۔ اس نظم میں ریاست پاکستان کے قیام کے بیان پر پوری قوم کو مبارک باد دیتے نظر آتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے جشن کے حوالے سے یہ اشعار تخلیق کیے گیے ہیں۔ ہر شعر کی ردیف مبارک باد رکھی گئی ہے اور اشعار کا آہنگ کلاسکی غزل سے مماثل ہے:

خدا کا شکر کہ جمہوریہ بنا ہے وطن
ہیں اپنے آپ پہ خود حکمراں مبارک باد
حضورِ قائدِ اعظمؒ ادب سے کہتے ہیں
فرشتگانِ بلند آسماں مبارک باد
حضورِ قائدِ ملّتؒ کھڑے ہیں کہنے کو
ارم کے شاعرِ شیریں بیاں مبارک باد
یہ جشنِ عیش کراں تا کراں، مبارک باد
پکارتے ہیں مہ و کہکشاں مبارک باد (۸)

ایک اور قومی نظم 'ہمایوں' لاہور، دسمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی جس کا عنوان 'واپسی' ہے۔ یہ واپسی دراصل افواجِ پاکستان کی محاذِ جنگ سے واپسی کے قصے پر مشتمل ہے۔ محاذِ جنگ کی مشکلات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ نظم پڑھتے ہوئے قاری خود کو محاذِ جنگ کی جملہ کاروایوں میں شریک پاتا ہے۔ انتہائی دلکش انداز میں جزئیاتِ جنگ کو پیش کیا ہے۔ یہ نظم تیرہ بندوں پر مشتمل ہے جو ہیئتی اعتبار سے مخمس کے طرز پہ ہے۔ محاذِ جنگ سے واپسی پر سپاہیوں کی ذہنی کیفیات کا نقشہ آخری دو بندوں میں منفرد انداز میں کھینچا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

خدا کا شکر دور ہوں جہانِ گیر و دار سے
اجل کی دست گاہ،دامِ مرگ بے وقار سے
فضا کی رزم گاہ سے،بساطِ شعلہ کار سے
ابھی پلٹ کے آ رہا ہوں حشرِ کار زار سے
کہ بال بال بچ گیا،قضا کے وار وار سے
یہ شیشموں کی نرم چھانوں،یہ خنک خنک ہوا
یہ مرغزار جن میں ایک عمر کھیلتا رہا
یہ کھیت یہ کھنڈر یہ بکریاں یہ گھر کا راستا
وہ سامنے مکاں رہا کسی ''نگارِشوخ'' کا
مرے وطن میں آ گیا،میں آ گیا،میں آ گیا (۹)

قومی ہیروز کو جعفر طاہر نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے دو نظمیں تخلیق کی ہیں۔ایک نظم 'اقبال' ہے جب کہ دوسری نظم 'کرنل قذافی کو سلام' کے عنوان سے ہے۔وہ صرف افواجِ پاکستان کو ہی خراجِ عقیدت پیش نہیں کرتے بلکہ قومی ہیروز کو باقاعدہ یاد رکھتے ہیں۔یہ دونوں نظمیں فکری اعتبار سے جدت و روایت کی پاس دار ہیں۔ان دو ہیروز کے حوالے سے ان کے ادراک میں جو وضاحتیں کروٹ لے رہی تھیں ان کو جعفر طاہر نے خوب صورت انداز میں نظم کیا ہے۔'اقبال' کے حوالے سے یہ چند اشعار درج ذیل ہیں:

یہ سیلِ نور یہ طوفانِ رنگ و رقصِ بہار
لبِ حیات پہ آنے لگا ترانہ ترا
سلام شاعرِ آفاق و شاعرِ ابدی
محیط سارے زمانوں پہ ہے زمانہ ترا
نکل کے جائے کہاں تیری بزم سے طاہر
یہ ایک سر جسے کافی ہے آستانہ ترا (۱۰)

اسی طرح انہوں نے لیبیا کے کرنل قذافی کو مسلم امہ کا ہیرو مانتے ہوئے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔یہ نظم مخمس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔اس نظم میں پاکستانی عوام اور مقتدر حلقوں کی طرف سے کرنل قذافی کو سلام پیش کیا گیا ہے۔آخری بند ملاحظہ ہو:

آب سادہ مئے صافی تیری
ایک ہی بات ہے کافی تیری
کیا ہو تعریف قذافی تیری
پیش کرتے ہیں یہاں صدر و عوام
لیبیا تیرے مجاہد کو سلام (۱۱)

مشرقی پاکستان کے الگ ہونے پر جو کشت و خون ہوا اس کا نوحہ بڑے پردرد انداز میں جعفؔر طاہر نے لکھا ہے۔اس نظم کا عنوان بھی 'نوحہ' رکھا ہے۔یہ نظم تہذیبی دولت اور اجتماعی شعور کا اعلانیہ ہے۔رقت آمیز کیفیات سے پُر ہے۔نظم سرگوشی کے عالم میں لرزہ طاری کردیتی ہے۔اس نظم کے آخری پانچ اشعار ان کیفیات کا بیّن ثبوت ہیں:

یہ بخششیں مرے جیسور و چاٹگام کی ہیں
عنائتیں ہیں یہ ڈھاکہ،سنار گاؤں کی
نہ کشتیاں،نہ وہ بجرے،نہ مانجھیوں کی صدا
ہو مستجاب دعا کاش نا خداؤں کی
دلوں کے سونے کھنڈر اب تو جگمگا اُٹھیں
الٰہی آج تو برسات ہو شعاعوں کی
کفن شہیدوں کے یا رب کبھی نہ میلے ہوں
نہ ہونے دیجیو توہین سورماؤں کی
ہمیشہ پھول برستے رہیں فضاؤں سے
مہک ہوا میں رہے خوں بھری قباؤں کی (۱۲)

۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء کو نیل آرمسٹرونگ نے جب چاند پر پہلا قدم رکھا تو یہ پوری دنیا کے لیے حیران کن لمحہ تھا جس کی دھوم پورے خطۂ ارض پر مچی۔انسان نے اپنے سیارے سے کسی دوسرے سیارے کی طرف پہلی پیش قدمی کی تھی اس لیے اس واقعہ سے عوام سے خاص تک متاثر ہوئے۔کئی ایک شعرانے اس موضوع نظمیں تخلیق کیں۔جعفؔر طاہر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔انھوں نے 'رہ نوردانِ سپہرِ قمر کے نام' کے عنوان سے نظم لکھی جو اوّل تا آخر استفہامیہ لہجے کی ہے۔نظم میں شاعر چاند پر قدم رکھنے والوں سے زمین پر موجود عجائبات اور نامور شخصیات کا ذکر کر کے استفسار کرتا ہے کہ کیا چاند پر بھی ان جیسا کچھ ہے کہ نہیں؟ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کہو تو کیسی رہی ملکِ مہتاب کی سیر؟
کیا تو چاند کا پچھلے دنوں سفر ہے بھی
وہاں کے گاؤں،کھنڈر،کھیت،لوگ کیسے ہیں؟
دکھوں کی آگ سے محفوظ کوئی گھر ہے بھی؟
وہاں کے گاؤں،کھنڈر،کھیت،لوگ کیسے ہیں؟
دکھوں کی آگ سے محفوظ کوئی گھر ہے بھی؟
رسومِ بندہ نوازی وہاں پہ کیسی ہیں؟
ہمارے ذوقِ وفا کی، انہیں خبر ہے بھی؟
خلا نوردو! یہ خوشبوئیں کیسی لائے ہو

کھلا ہوا چمنِ جاں کوئی اُدھر ہے بھی؟
وہاں بھی چاندنی راتوں میں پھول کھلتے ہیں
ہوائے ناز کے جھونکوں میں کچھ اثر ہے بھی؟
کہو تو آنگنوں سے کیا صدائیں آتی ہیں
یہ چوڑیوں کے چھناکے یہ شوروشر ہے بھی؟(۱۳)

تمام خطوں کی شاعری میں مذہبی شاعری کا بہر حال حصہ رہا ہے اور ہر شعر نے کسی نہ کسی شخصیت کو اپنا ماڈل جانتے ہوئے اظہارِ عقیدت کیا ہے۔مسلمان شاعروں کے حضور اکرمؐ سے محبت ایک فطری جذبے کے طور پر ہمیشہ کارفرما رہی ہے۔نعت گو شعرا کا سلسلہ اسلام کے اٹھان سے لے کر عصرِ رواں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے پیرائے اظہار میں اظہارِ عقیدت کرتا رہا ہے۔جعفر طاہر نے بھی اپنے مخصوص انداز میں پابند نظم کی ایک مخصوص کرافٹ میں مذہبی شاعری تخلیق کی ہے جس میں آپؐ کی صفات فضائل،کرامات اور دعائیہ انداز پر مشتمل اشعار شامل ہیں۔نظم کا ردھم،آہنگ،بہاؤ مثالی حیثیت رکھتا ہے۔آخری دو بند دعائیہ انداز کے ہیں ان کا یہاں پیش کرنا لطف سے خالی نہیں ہے:

مولا تو ہمیں دولتِ احساسِ زیاں دے
دے سوزِ یقیں،ذوقِ وفا قلبِ تپاں دے
رہ جائے زمانے میں غلاموں کی تری لاج
اے صاحبِ معراجؐ!

اس بندۂ ناچیز پہ رحمت کی نظر ہو
میں نعت کہوں مجھ کو عطا علم و ہنر ہو
اک شاعر بدنام ، نہ عالِم ہوں نہ الحاج
اے صاحبِ معراجؐ! (۱۴)

'کارواں' نعت رسولؐ نمبر میں شائع ہونے والی نعت جو آپؐ سے شاعر کی بے پناہ عقیدت وارادت کی غماز ہے اور شاعر قادرالکلامی پر دال ہے،چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہزار داغ ترے عشق میں نصیب ہوئے
ہزار پھول تری نعت کے چمن میں لگے
اثر یہ غارِ حرا کے ہے سنگ ریزوں کا
کہ آج لعلوں کے انبار ہیں یمن میں لگے
میں نعت خواں جو ترا ہوں تو پھر عجب کیا ہے
شمار میرا بھی ہونے جو اہلِ فن میں لگے (۱۵)

کربلا بہ طور شعری استعارہ عربی،فارسی اور اردو ہندی شعرا کے یہاں کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔بالخصوص

اردو شاعری میں انیس و دبیر نے رزم گاہِ کربلا کو تمام تر جزئیات سمیت شاعری میں ڈھال کر کلاسیک کا درجہ عطا کیا۔فکری اعتبار سے مرثیے کے ہزاروں پہلو زیرِ بحث آئے۔ ہر شعر نے حتیٰ المقدور اظہارِ عقیدت پیش کیا۔جعفر طاہر نے 'قسمتِ سادات' کے عنوان سے ایک نظم تخلیق کی جس میں حضرت زینبؑ کو مخاطب کر کے اظہارِ افسوس کیا گیا ہے۔پوری نظم درد کی لَے پہ مکمل ہوئی ہے۔'پہ رونا آیا' کی ردیف غمگین لہجے کو مہمیز کرنے کے مصداق ہے۔پوری نظم آٹھ اشعار پر مشتمل ہے جس کے آخری چار اشعار اس مؤقف کی تائید کے لیے ضروری ہیں:

کربلا، کوفہ، کبھی شام کی یاد آتی ہے
اپنے مولا کے مقامات پہ رونا آیا
ننگے سر فاطمہؑ کی بیٹیاں بازاروں میں
ہم کو تو قسمتِ سادات پہ رونا آیا
پھر گئی آنکھ میں شبیر تری تشنہ لبی
آئی برسات تو برسات پہ رونا آیا
غمِ شبیرؑ پہ رویا کبھی جعفر طاہر
کبھی اُمّت کے خیالات پہ رونا آیا (۱۶)

ہر شاعر اپنی تہذیب و ثقافت کا زندہ استعارہ ہوتا ہے۔اس کا پیرایۂ اظہار بے شک جو بھی ہو اپنی روایت سے ایک مضبوط تعلق استوار کیے ہوتا ہے۔مظاہرِ فطرت سے ہم کلام ہونا یا رسم و رواج کے آہنگ پہ جودتِ طبع کا اظہار کرنا ہر شعر کا خاصہ رہا ہے۔طبع کی ترنگ اظہار کی کامل صورت ہوتی ہے اور شعرا کے یہاں تو ایسی سرمستیوں کی ہزار صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔جعفر طاہر کی نظموں میں دو نظمیں 'نظم' اور 'جھولا' ایسی نظمیں ہیں جو ان کی ذاتی شعری صداقت پر عمدہ دلیل ہیں۔ان نظموں میں مناظر سے کشید کیے ہوئے لطف و کرم کو تخلیقی آہنگ پہ بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ان نظموں کا ہر مصرع نارسائی کا دکھ اور درد کی کسک میں ڈوبا ہوا ہے۔'نظم' کے عنوان سے جو نظم ہے وہ دعوتِ محبوب کا اعلامیہ ہے جب کہ 'جھولا' مشرقی محبوباؤں کے ناز و ادا اور بے نیازی کا استعارہ ہے۔'نظم' غزل کے روایتی آہنگ پہ ہے جب کہ 'جھولا' مختلف بندوں پر مشتمل ہے۔دونوں نظموں کے چند اشعار بہ طور نمونہ پیشِ خدمت ہیں:

وہ رواں ہے محملِ موج موج وہ بساطِ بحرِ گہر گہر
مرے ساحلوں پہ کئی عدن مرے ساحلوں پہ کئی یمن
یہ ہے درد میرے شباب کا یہ حجاب کیا یہ نقاب کیا
تو قبول کر یہ سلامِ شمس و قمر سجودِ مہ و پرن
یہ کلام طاہر خوش نوا مری جان ہے آئینہ وفا
بہ قبولِ دستِ حنا طلب نمِ اشک تحفۂ خونِ من (۱۷)

جدید تہذیب کے عقبی دیار کا ایک کردار گجرات کے کسی دیہات کی لڑکی ہے جو اپنی ترنگ میں جھولا جھولتی ہے۔یہ

پوری نظم دیہاتی منظر کشی کا شاہکار ہے جو جعفر طاہر کے رومانوی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔اسی نظم کے دو بند جو منظر نگاری کی جان ہیں ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔دوسرے بند میں جعفر طاہر نے 'نرم وگداز سینے' کو اُبھرتے ہوئے 'سفینے' سے تشبیہ دی ہے۔یہ نادر تشبیہ جعفر طاہر کے خلاقانہ ذہن کی وہ پیش کش ہے جس کی مثال اردو کی شعری روایت میں ملنا مشکل ہے:

وہ زانوؤں پہ جھک کے لینے لگی ہلارا
تھرّا گئی خدائی کانپ اُٹھا دشت سارا
ہم جولیاں پکاریں برگ و شجر پکارا
اب تھامنا خدارا اب تھامنا خدارا
لیکن وہ ہے کہ ظالم پینگیں بڑھا رہی ہے
گاؤں کی شہزادی جھولا جھلا رہی ہے
انگڑائی لے کے اُٹھی اک سروقد حسینہ
فردوس کی جبیں پہ آنے لگا پسینہ
آنچل کی سلوٹوں میں نرم وگداز سینہ
جیسے نکل رہا ہو ڈوبا ہوا سفینہ
تقدیر کی جبیں پہ ٹھوکر لگا رہی ہے
گاؤں کی شہزادی جھولا جھلا رہی ہے (۱۸)

جعفر طاہر کا فکری کینوس بہت وسیع ہے۔نظم نگاری ان کی وہ پسندیدہ صنف ہے جس میں ان کی منفرد شاعرانہ تخلیقیت کے جوہر دیکھے جا سکتے ہیں۔نظم نگاری میں جو ہیئت ان کو مرغوب ہے وہ 'کینٹو' ہے جس میں بلاشبہ وہ اردو کی شعری روایت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ان کی بیانیہ نظموں کا ایک اہم وصف وہ روانی و جاذبیت ہے جو انہیں معاصرین میں الگ پہچان عطا کرتی ہے۔

جعفر طاہر کی افتادِ طبع اسلامی تصورات اور مذہبی انسلاکات سے گہرا رشتہ رکھتی ہے۔اس بات کا بین ثبوت ان کی تصنیف 'سلسبیل' ہے۔تاہم ان کی نظموں میں خارجی اور داخلی عوامل میں مناظرِ قدرت سے لے کر احساساتِ انسانی کے تمام تر لوازمات بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔وہ اپنے سماجی وتہذیبی شعور پر سائنسی ایجادات اور مشینی زندگی کے اثرات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں محض رومان کے نقوش نہیں بلکہ ترقی پسندانہ رجحانات بھی ملتے ہیں۔

فنی پختگی اور موضوع کو پُر خلوص جذبے کے ساتھ پیش کرنے کے تخلیقی سلیقے نے جعفر طاہر کو معاصرین میں ایک الگ اور منفرد مقام پر فائز کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کوثر مظہری، جدید نظم حالی سے میرا جی تک (نیو دہلی: مظہر پبلی کیشن، ۲۰۰۵ء) ص ۲۲

۲۔ عتیق اللہ، مغرب میں تنقید کی روایت (لاہور: عکس پبلی کیشن، ۲۰۱۸ء) ص ۱۴۰

۳۔ عقیل صدیقی، احمد، جدید اردو نظم نظریہ و عمل (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۴ء) ص ۱۰۷

۴۔ ایضاً، ص ۹۰

۵۔ ماہِ نو، جمہوریت نمبر (کراچی، ۱۹۵۸ء) ص ۱۱

۶۔ غبارِ کارواں (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۹ء) ص ۲۳

۷۔ مجلّہ کارواں (جھنگ: گورنمنٹ کالج، ۶۹۔۱۹۶۸ء) ص ۱۷ تا ۳۷

۸۔ ماہِ نو، جمہوریت نمبر، ص ۱۹

۹۔ ہمایوں (لاہور، دسمبر ۱۹۵۲ء) ص ۷۰۷۔۷۰۸

۱۰۔ لیل ونہار (لاہور، ۱۲/ اپریل ۱۹۶۳ء) ص 'ن' تا 'س'

۱۱۔ مجلّہ کارواں، ص ۱۳۱

۱۲۔ اوراق (لاہور، ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء) ص ۱۲۸

۱۳۔ اوراق (لاہور، اپریل ۱۹۶۹ء) ص ۱۰۰

۱۴۔ شام و سحر (لاہور، جون ۱۹۸۸ء) ص ۲۲

۱۵۔ مجلّہ کارواں، نعتِ رسولؐ نمبر (جھنگ: گورنمنٹ کالج، ۱۹۸۱ء) ص ۳۰۔۳۱

۱۶۔ پندرہ روزہ ذوالفقار (پشاور، یکم مارچ ۲۰۰۴ء) ص ۳۴

۱۷۔ عکسی نقل بیاض سیّد اسحاق شاہ، ص ۶۲

۱۸۔ منظور سیال، شاعر نہیں ساحر تھا وہ (ملتان: حافظ جمال روڈ، ۲۰۰۵ء) ص ۱۱۸۔۱۱۹